http://Paksociety.com

قسط نمبر 21

حصہ دوم

"کب تک بتاؤ گی؟" اشتیاق سے پوچھا گیا۔

"کچھ دنوں تک" تامّل سے بتایا گیا۔

"میں انتظار کروں گا۔" وعدے کی طرح دہرایا گیا۔

"جانتی ہوں۔" یقین دہانی کی گئی۔

اور پھر آگے کچھ بھی نہیں تھا۔۔۔یوں جیسے کوئی پہاڑ آگیا ہو یا پھر کھائی کہ نہ لفظ رہے ہوں، نہ وقت۔

عنایہ نے اپنے فون پر انگلیوں سے سکرول کرتے ہوئے اُن میسجز کے تھریڈ کو دیکھا، پڑھا، یوں جیسے پہلی بار اُس گفتگو کو پڑھ رہی ہو۔یوں جیسے وہ گفتگو پہلی بار ہوئی ہو۔اُس کی مخروطی خوب صورت دودھیا انگلیاں فون کی سکرین پر نہیں، جیسے اُن لفظوں پر پھیل رہی تھیں۔

وہ سوال جواب اتنے سالوں سے کرتے آرہے تھے وہ۔۔۔اسی sequence میں۔۔۔اور ہر بار گفتگو وہاں ہی جا کر رُکتی تھی جہاں اس بار ختم ہوئی تھی۔۔۔اس سے آگے کے سوال جواب دونوں کے پاس نہیں تھے یا شاید ہمّت نہیں تھی کہ اس سے آگے وہ کچھ پوچھتے۔۔۔لیکن مہینے میں کم از کم ایک بار کسی بھی دوسرے موضوع پر بات کرتے کرتے

اُن کے درمیان اُس گفتگو کا تبادلہ ضرور ہوتا۔۔۔وہ سوال جواب کسی پرانی یاد یا میوزک کی طرح بیک گراؤنڈ میں چلتی۔ جیسے ابھی ہوا تھا۔۔۔وہ کسی اور موضوع پر بات کر رہے تھے، اور بات وہاں تک آگئی تھی۔۔۔اور جہاں آگئی تھی، وہاں رک گئی تھی۔۔۔اب وہاں سے موضوع بدلنے کے لئے انہیں پھر کچھ وقت چاہیے تھا۔

وہ ایرک سے محبت نہیں کرتی تھی، اور اُسے شبہ تھا شاید وہ بھی نہ کرتا ہو۔۔۔بہت سے احساس وہم اور خوش فہمی بھی تو ہو سکتے تھے، مگر یہ بھی درست تھا کہ اتنے سالوں میں ایرک کے علاوہ اُس کے سرکل میں کوئی مرد دوست نہیں تھا۔۔۔امریکہ، پاکستان دونوں جگہ۔۔۔سکول، کالج۔۔۔ہر جگہ عنایہ کسی لڑکے کو اپنا دوست نہیں بنا سکی تھی، نہ وہ اتنی بے تکلفی کا مظاہرہ کر سکتی تھی اور نہ اُسے ایسی کسی دوستی کی ضرورت محسوس ہوئی تھی۔

ایرک بھی ایسا ہی تھا، اور یہ زیادہ حیرانی کی بات تھی۔ کیوں کہ وہ امریکہ میں رہتا تھا جہاں طرزِ زندگی بہت مختلف تھا۔ اس کے باوجود عنایہ کی طرح وہ بھی ریزروڈ تھا۔ اور جب وہ عنایہ سے کہتا تھا کہ اُس کی کوئی گرل فرینڈ نہیں تو عنایہ کو یقین ہوتا تھا کہ ایسا ہی ہے۔ اور اگر وہ یہ کہتا تھا کہ اگر اُس کی پچھلے کئی سالوں سے کسی لڑکی کے ساتھ دوستی ہے بھی تو وہ عنایہ تھی تو اُسے اس پر بھی یقین تھا۔

اور اس دوستی کے باوجود دونوں کے درمیان بے تکلفی نہیں تھی، شاید اُس کی وجہ فاصلہ تھا یا کلچر یا عنایہ کا وہ مزاج جس سے ایرک بخوبی واقف تھا۔ اتنے سالوں کے بعد تقریباً ہر روز ای میل، میسجز یا فون کے ذریعے ایک دوسرے سے ہر وقت رابطے میں رہنے کے باوجود اُن کے درمیان ہونے والی گفتگو مخصوص موضوعات کے گرد گھومتی تھی۔۔۔کبھی بھی وہ صرف "میں اور تم" پر نہیں گئی تھی اور یہ دونوں کی طرف سے کی جانے والی شعوری کوششوں کا نتیجہ تھا۔

عنایہ ایک مہینہ پہلے ریذیڈنسی کے لئے امریکہ آئی تھی اور ایرک کو چاہنے کے باوجود اُس نے یہ نہیں بتایا تھا، بتانے کا فائدہ نہیں نقصان تھا۔ پتہ نہیں کیوں اُسے یہ خدشہ تھا کہ اُس کے امریکہ آجانے پر وہ اُس سے ملنے کی بھرپور کوشش کرے گا اور یہ اُس کے لئے اس لئے بہت آسان ہوتا کیوں کہ وہ حمین اور جبریل کے ساتھ مسلسل رابطے میں تھا۔ عنایہ اُن دونوں سے یہ کہہ چکی تھی کہ وہ اُس کے امریکہ آجانے کے بارے میں ایرک سے کچھ نہیں کہیں، اُن دونوں

http://Paksociety.com

نے اُس سے کوئی سوال نہیں پوچھا تھا۔ ایرک جیسے اُن کی فیملی کے لئے ایک ایسی کھلی حقیقت تھا جس سے سب آنکھیں چرانا چاہتے تھے لیکن چرا نہیں پاتے۔

ایرک بہت عرصہ پہلے اُس کے اور امامہ کے درمیان ڈسکس ہو چکا تھا۔۔۔ عنایہ جان چکی تھی وہاں اُس کے لئے کوئی مستقبل نہیں تھا۔۔۔ اس شادی میں کیا ایشوز تھے اور کیا خدشات، کیا اندیشے تھے اور کیا مسائل۔۔۔ عنایہ آنکھیں بند کر کے رٹے رٹائے انداز میں گنوا سکتی تھی۔ اُس نے یہ سب کچھ امامہ سے اتنی بار سُنا تھا اور اُس نے امامہ کی خواہش کا احترام کیا تھا۔

اُس نے آہستہ آہستہ ایرک سے دور جانے کی کوشش کی تھی اس کے باوجود کہ امامہ نے اُسے کبھی ایرک سے قطع تعلق کرنے کے لئے نہیں کہا تھا لیکن عنایہ کا خیال تھا اُسے یہ "عادت" بدل دینی چاہیے، جو دونوں کے لئے ایک سٹیج پر آکر آزار بن سکتی تھی۔

وہ دونوں زیادہ تر ای میلز اور ٹیکسٹ میسجز کے ذریعہ رابطے میں تھے۔ عنایہ نے کوشش کی تھی یہ رابطہ کم ہونے چاہیے، تعلیمی مصروفیات، پروفیشنل کمٹمنٹس، اُس کے پاس بہترین بہانوں کے طور پر موجود تھے۔ لیکن اس کے باوجود ایرک سے اُس کا رابطہ ٹوٹ نہیں سکا اور یہ کمال ایرک کا تھا، وہ جُڑا رہا تھا، اُس کی بے اعتنائی، بے رُخی، سرد مہری کے باوجود۔۔۔ یہاں تک کہ عنایہ کو شدید قسم کی ندامت ہونے لگی تھی۔۔۔ پتہ نہیں اُس شخص میں اتنی برداشت اور تحمل کیسے تھی کہ وہ اپنے آپ کو نظر انداز کئے جانا اور کم اہمیت پانے پر بھی کوئی اعتراض، کوئی احتجاج نہیں کرتا تھا۔ اُس سے یہ نہیں پوچھتا تھا کہ اُسے بیٹھے بٹھائے کاموں کا ڈھیر اب ہی کیوں یاد آنے لگا تھا اور نہ ہی یہ کہ وہ خود بھی ڈاکٹر تھا، اُس سے زیادہ مصروف تھا تو کم از کم وہ پروفیشنل مصروفیات کا بہانہ اُس کے سامنے پیش نہ کرے۔ وہ دنوں، ہفتوں کے لئے اُس کی کسی ای میل کسی میسج کا جواب دیے بغیر غائب رہتی اور وہ پھر بھی اُس کو ٹیکسٹ میسجز کے ذریعہ اپنا حال احوال، اپنی مصروفیات کے بارے میں بتاتا رہتا اور پھر وہ کئی دنوں بعد اُس کے بھیجے ہوئے کسی نہ کسی ٹیکسٹ، کسی نہ کسی ای میل کا جواب دینے پر مجبور ہو جاتی اور وہ اپنی غیر حاضری کا جو بھی بہانہ بناتی، وہ بغیر بحث کے قبول کر لیتا، چاہے وہ کتنا ہی ناقابلِ یقین کیوں نہ ہوتا، اور اُس کی یہ acceptance جیسے اُس کے احساسِ جُرم کو اور بڑھا رہی تھی۔ وہ

http://Paksociety.com

بچپن میں ایسا نہیں تھا جیسا بڑا ہو کر ہو گیا تھا۔ اتنے سالوں میں عنایہ میں اتنی تبدیلیاں نہیں آئی تھیں جتنی ایرک میں آئی تھیں، اور اُس کی بہت سی دوسری وجوہات کے علاوہ ایک بنیادی وجہ اُس کا قبولِ اسلام بھی تھا۔

وہ 18 سال کی عمر میں ایرک سے عبداللہ ہو گیا تھا لیکن وہ آج بھی اپنے سوشل سرکل میں ایرک کہلاتا تھا یا پھر ایرک عبداللہ۔۔۔ اُن لوگوں کے امریکہ سے آجانے کے بعد بھی ایرک اُن سے رابطے میں رہا تھا، وہ اُسے بھی ای میل کرتا تھا اور امامہ کو بھی، اور اُس کی ہر ای میل امامہ کو جیسے ایک reminder کی طرح لگتی تھی، حالانکہ اُس کی ای میلز میں رسمی گفتگو کے سوا کچھ نہیں ہوتا تھا۔

وہ بھی میڈیسن میں ہی ریذیڈنسی کر رہا تھا۔۔۔ عنایہ کی طرح۔۔۔ اُن کے پروفیشن نے دو مختلف ملکوں میں رہتے ہوئے بھی اُن دونوں کو بڑے عجیب انداز میں ایک دوسرے سے باندھے رکھا تھا۔۔۔ وہ کنگ ایڈورڈ سے پڑھی تھی وہ ایریزونا سے۔۔۔ اُسے آئی سرجن بننا تھا ایرک کو ہارٹ۔۔۔ مگر اُن کے مشترکہ پروفیشن نے جیسے اُن کے لئے گفتگو کے بہت سارے موضوعات دے دیے تھے۔

قبولِ اسلام کے بعد یونیورسٹی میں گریجویشن کے دوران وہ چند سال سمرز میں پاکستان آتا رہا تھا لیکن ایک بار میڈیکل میں جانے کے بعد وہ آنا جانا ختم ہو گیا تھا۔ امامہ اس بات پر خوش ہوئی تھی، وہ کبھی بھی اُسے پاکستان آنے سے منع نہیں کر سکتی تھی کیوں کہ سالار سمیت فیملی کے کسی بھی شخص کو ایرک کے پاکستان آنے پر اعتراض نہیں تھا اور وہ اُسے منع کر کے اُس کا دل نہیں توڑنا چاہتی تھی لیکن اس طرح اُس کا ہر سال اُن کے پاس آنا امامہ کے خدشات بڑھاتا رہا تھا اور جس سال پہلی بار اُس نے پاکستان نہ آنے کے بارے میں اُنہیں اطلاع دی تھی، امامہ نے جیسے سکون کا سانس لیا تھا اُسے یقین تھا وہ اب اپنی زندگی کی نئی مصروفیات میں سب کچھ بھول جانے والا تھا۔

کچھ ایسا ہی عنایہ نے بھی سوچا تھا۔ اُسے بھی لگا تھا ایرک بدل جائے گا، اور وہ اس کے لئے ذہنی طور پر تیّار بھی۔ میڈیسن کی تعلیم مشکل تھی پھر اب اُس کی زندگی میں اور لوگ آرہے تھے۔ وہ اُن کے خاندان اور اُسے اگر بھول بھی جاتا تو اُس کے لئے نارمل ہوتا۔۔۔ ہلکی کسک اور گلہ رکھنے کے باوجود۔۔۔ لیکن ایسا نہیں ہوا تھا۔ اُس نے پاکستان آنا جانا چھوڑا تھا، اُن سے رابطہ ختم نہیں کیا تھا۔

http://Paksociety.com

اوراس تعلق اور رابطے کے باوجود اُن دونوں کے درمیان اعتراف یا اظہار کا کوئی کمزور لمحہ نہیں آیا تھا۔ اُسے بار بار یہ احساس ہوتا تھا کہ وہ اُس کے لئے اسپیشل تھی لیکن یہ جملہ اُس نے کبھی اُس کی زبان سے نہیں سُنا تھا، اور یہ شاید بہت اچھا ہی تھا۔ تعلق ختم کرتے ہوئے گلے اور شکایتیں کچھ کم رہتیں۔۔۔ تکلیف بھی۔۔۔ یہ عنایہ سکندر کا خیال تھا۔

اُس کے لئے اب رشتے دیکھے جا رہے تھے۔ Matchmaking کی کوششیں ہو رہی تھیں۔ اُسے اندازہ تھا اُس کی ریذیڈنسی کے دوران ہی اُس کی منگنی یا شاید شادی ہو جائے گی، اور وہ اس کے لئے اپنے آپ کو ذہنی طور پر تیار کرتے ہوئے اُن فیملیز اور لڑکوں سے بھی مل رہی تھی جن سے اُس کا رشتہ طے پانے کا امکان تھا اور اس سب کچھ کے درمیان ایرک عبداللہ وہیں کا وہیں کھڑا تھا۔ نہ وہ زندگی سے جاتا تھا، نہ دل سے نہ دماغ سے۔

اُس دن بھی اُن دونوں کے درمیان ایک Chatting App پر معمول کے میسجز کا تبادلہ ہو رہا تھا۔ وہ اُسے اپنے ہاسپٹل کا کوئی مسئلہ بتا رہا تھا اور اُس نے جواباً بڑی روانی سے اُسے اپنے ہاسپٹل کا نام بتاتے ہوئے وہاں کے کسی مسئلے کا ذکر کیا اور send کا بٹن دباتے ہوئے بے اختیار اپنی غلطی پر پچھتائی۔ اُس کا text اب فون کی سکرین پر نمودار ہو چکا تھا اور اُسے یقین تھا ایرک عبداللہ اتنا ڈفر نہیں تھا کہ وہ اُس جملے کو نظر انداز کر کے گزر جاتا۔ اُس کے جملے کے بعد بہت دیر دوسری طرف سے کوئی جواب نہیں آیا تھا۔ یوں جیسے وہاں سب کچھ ساکت ہو گیا تھا۔ پھر بالآخر وہ text آیا جس کی اُسے توقع تھی۔

"تم امریکہ میں ہو؟" اُس کا دل چاہا وہ لکھ دے سمارٹ فون نے ہاسپٹل کا نام غلطی سے لکھ دیا تھا۔ یا کوئی اور جھوٹ یا بہانہ۔۔۔ وہ تو مان لیتا تھا۔۔۔ سوال جواب اور بحث کب کرتا تھا لیکن وہ جھوٹ نہیں بول سکتی تھی بس دل چاہا تھا اُسے ہاں کہہ دے اور اُس نے یہی کیا تھا۔

اُس کے yes نے ایرک عبداللہ کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔ یہ عنایہ کا خیال تھا۔ فون ہاتھ میں پکڑے اُس کی سکرین پر نظریں جمائے وہ اُس yes کے بعد کسی ردِ عمل کا انتظار کرتی رہی۔۔۔ خوشی، حیرت، بے یقینی، غصّہ۔۔۔ کسی بھی ردِ عمل کا۔۔۔ وہ آن لائن تھا اور وہاں سکوت تھا۔۔۔ ایسا سکتہ اور سکوت کہ ایک لمحہ کے لئے عنایہ کو ڈر لگا۔ اُس نے Hello لکھ کر اُسے جیسے اس سکتے سے جھنجھوڑنے کی کوشش کی تھی۔

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

پاک سوسائٹی خاص کیوں ہیں:-

ہائی کوالٹی پی ڈی ایف

ایک کلک سے ڈاؤنلوڈ

کتاب کی مُختلف سائزوں میں اپلوڈنگ

ایڈ فری لنکس

ڈاؤنلوڈ اور آن لائن ریڈنگ ایک پیج پر

ناولز اور عمران سیریز کی مُکمل رینج

Click on http://paksociety.com to Visit Us

پاک سوسائٹی کو فیس بُک پر جوائن کریں http://fb.com/paksociety

پاک سوسائٹی کو ٹوئٹر پر جوائن کریں http://twitter.com/paksociety1

پاک سوسائٹی کو گُوگل پلس پر جوائن کریں https://plus.google.com/112999726194960503629

ہمیں وزٹ کرنے کے لئے ہمارا ویب ایڈریس براؤزر میں لکھیں یا گُوگل میں پاک سوسائٹی تلاش کریں۔

اپنے دوست احباب اور فیملی کو ہماری ویب سائیٹ کا بتا کر پاکستان کی آن لائن لائبریری کا ممبر بنائیں۔

اِس خوبصورت ویب سائٹ کو چلانے کے لئے ہر ماہ کثیر سرمایہ درکار ہوتا ہے، اگر آپ مالی مدد کرنا چاہتے ہیں تو ہم سے فیس بُک پر رابطہ کریں۔۔۔

ہمیں فیس بُک پر لائک کریں اور ہر کتاب اپنی وال پر دیکھنے کے لئے امیج پر دی گئی ہدایات پر عمل کریں:-

http://paksociety.com

"تم نے مجھے بتایا نہیں؟" دوسری طرف سے اُس کی تحریر اُبھری تھی۔ اس بار خاموشی عنایہ کی طرف چھائی تھی۔ وہ 101 بہانے بنا سکتی تھی لیکن ایک بھی بہانہ بنانا نہیں چاہتی تھی۔ اُن دونوں کے درمیان شاید اب وہ لمحہ آ گیا تھا جب اُسے صاف گوئی کا مظاہرہ کرنا چاہیے تھا۔

"تم مجھے ملنے کے لئے کہتے اور میں ملنا نہیں چاہتی اس لئے۔" دوسری طرف بہت لمبی خاموشی چھائی تھی اس بار، اُتنی ہی لمبی جتنا عنایہ توقع کر رہی تھی۔

"Alright" پھر سکرین چمکی اور بُجھ گئی۔۔۔ وہ ایسا ہی کرتا تھا۔۔۔ بحث کرتا ہی نہیں تھا، غصہ دکھاتا ہی نہیں تھا argument، اُس کے بس کی بات نہیں تھی۔ وہ اسی طرح ہتھیار ڈالنے والے انداز میں بات کیا کرتا تھا۔ ایک لمحہ کے لئے عنایہ کو غصّہ آیا اور وہ خوامخواہ احساسِ ندامت لے کے بیٹھی تھی۔۔۔ اچھا ہے صاف صاف کہہ دیا اور نہ ملنے سے اُسے فرق کیا پڑنا تھا، وہ ویسے بھی دو مختلف سٹیٹس میں تھے۔۔۔ ملنے کے لئے بھی انہیں چھٹیوں کا انتظار کرنا پڑتا۔ وہ سوچ رہی تھی ساتھ ہی اپنے آپ کو توجیہات بھی دے رہی تھی۔

"میں پاکستان جا رہا ہوں۔" کچھ دیر بعد اُبھرنے والے اگلے ٹیکسٹ نے اُسے چونکایا۔

"کب؟" اُس نے بے اختیار پوچھا۔

"17 کو" جواب آیا۔

"کیوں؟" اُس نے اب وہ پوچھا جو پوچھنا چاہتی تھی۔

جواب نہیں آیا اور کئی دنوں تک نہیں آیا۔

*****

ہشام نے اُسے دیکھتے ہوئے چائے کا مگ خالی کیا۔۔۔ وہ اُس سے کچھ فاصلے پر اشاروں کی زبان میں اپنے سامنے بیٹھی عورتوں اور بچوں سے مخاطب انہیں صحت و صفائی کے حوالے سے سمجھاتے ہوئے اپنے بیگ سے اس سے متعلقہ چیزیں

http://Paksociety.com

نکال نکال کر دے رہی تھی۔۔۔ صابن۔۔۔ ٹوتھ پیسٹ۔۔۔ ٹوتھ برش، ٹوتھ پک، روئی، نیل کٹر، کاٹن buds، شیمپو، فرسٹ ایڈ کٹ اور اُس میں موجود سامان۔۔۔ وہ سب عام استعمال کی چیزیں تھیں جنہیں کسی ترقی یافتہ یا ترقی پذیر ملک میں بھی بیٹھ کر کسی کو اُن کا استعمال سمجھانے کی ضرورت نہیں پڑتی تھی۔۔۔ لیکن وہ داداب تھا، کینیا کے بارڈر کے قریب UNHCR کے افریقہ میں برے ترین کیمپوں میں سے ایک۔۔۔ جہاں افریقہ میں قحط اور خانہ جنگی سے متاثرہ لوگوں کی ایک بڑی تعداد آباد تھی۔

اور اُن دونوں کو وہاں آئے ایک ہفتہ ہو گیا تھا۔۔۔ داداب میں یہ اُن کا پہلا وزٹ تھا، لیکن وہ پچھلے چار سالوں میں UNHCR کے بہت سارے کیمپس میں جا چکے تھے۔ افریقہ، ایشیا، لاطینی امریکہ۔۔۔ یہ اُن کی تفریح بھی تھی، passion بھی اور کام بھی۔

لکڑی کی ایک خالی پیٹی کو اُلٹا کر بیٹھے ویسی ہی ایک دوسری پیٹی کو میز بنائے اور اُس پر چائے کے مگ رکھے، اپنی چائے میں بسکٹ ڈبو ڈبو کر کھاتے ہوئے وہ شدید تھکن کے عالم میں بھی اُسے دیکھتا رہا۔۔۔ وہ مختلف جگہوں پر نئے آنے والے پناہ گزینوں کے ساتھ اُس دن صبح سے ہونے والا اُن کا 28 واں کیمپ تھا۔۔۔ وہ گروپ کی شکل میں نکلے تھے اور اب دو دو کی ٹولیوں میں لگے نئے خیموں میں جا جا کر اندراج کرتے ہوئے صحت و صفائی کے حوالے سے سامان تقسیم کرتے پھر رہے تھے اور اب شام ہونے والی تھی۔۔۔ ہشام نے اپنا کام ختم کر لیا تھا۔۔۔ گرم پانی کے فلاسک اور پشت پر لدے بیگ سے مگ اور چائے کا سامان نکال کر وہ اپنی ساتھی کے واپس آنے سے پہلے ہی چائے بنا کر اُس کا انتظار کر رہا تھا اور وہ ابھی بھی وہیں تھی۔۔۔ اُسی طرح اپنے کام میں محو۔۔۔ اُس نے اپنا مگ دوبارہ چائے سے بھرا۔

وہ اُس کے ساتھ دنیا کے بہت سارے ملکوں میں جا چکا تھا اور لوگ کوئی بھی ہوں، زبان کوئی بھی اُس نے اپنی ساتھی کو کبھی کسی دقّت کا شکار نہیں دیکھا تھا۔۔۔ وہ اشاروں کی زبان کی ماہر تھی لیکن ہشام جانتا تھا وہ اشاروں کے بغیر بھی کسی گونگے سے اُس کے دل کا حال اگلوا لیتی۔۔۔ ایک عجیب گرم جوشی تھی اُس میں جو کسی کا بھی دل موم کر کے رکھ دیتی اور وہ اب یہی کر رہی تھی۔۔۔ اُن گندے، کمزور، بیمار، قحط زدہ، تباہ حال لوگوں کے بیچ بیٹھی وہ پروفیشنل مہارت سے اپنا کام کرتے ہوئے اشاروں کی زبان اور ٹوٹی ہوئی مقامی زبان میں اُن سے گپ شپ کرنے کی کوشش کر رہی

http://Paksociety.com

تھی۔۔۔بچوں کے ساتھ ہلکی پھلکی چھیڑ چھاڑ، عورتوں کے ساتھ مسکراہٹوں اور معانقوں کا تبادلہ۔۔۔وہ اپنا کام تقریباً ختم کرنے کے قریب تھی۔۔۔اُس کے پاس موجود سامان ختم ہو چکا تھا اور جس خالی بیگ میں وہ تھا، وہ بیگ اُس نے ایک پانچ سالہ بچے کو اوڑھانے والے انداز میں دیا تھا جو بار بار اُس بیگ کو لینے کے لئے ہاتھ پھیلا رہا تھا اور پھر ہشام نے ایک چھوٹی بچی کو اُس کے بالوں میں لگی ہوئی ایک خوبصورت ہیئر پن کو چھوتے دیکھا۔وہ زمین پر پڑے ایک لکڑی کے کریٹ پر بیٹھی تھی اور وہ بچی اُس کے عقب میں جا کر اُس کے تقریباً جوڑے والے انداز میں لپیٹے ہوئے بالوں کو چھیڑ رہی تھی اور پھر اُس نے اُس ہیئر پن کو اتارنے کی کوشش کی، ہشام نے اُسے پلٹ کر اُس بچی کو اُٹھا کر اپنی گود میں لیتے دیکھا اور پھر اپنے بالوں میں لگی ہوئی ہیئر پن اُتار کر اُس نے اُس بچی کے گھنگھریالے بالوں میں لگا دی اور اُسے گود سے اُتارتے ہوئے وہ اُٹھ کھڑی ہوئی اور پہلی بار وہ بالآخر ہشام کی طرف متوجہ ہوئی جو تب تک چائے کا دوسرا مگ بھی ختم کرنے کے قریب تھا۔انہیں وہاں سے ابھی کافی دور چل کر جانا تھا، جہاں سے اُنہیں UNHCR کی گاڑی مل جاتی جو اُنہیں اُس جگہ لے جاتی جہاں پر اُن تمام ورکرز کی رہائش تھی۔

ہشام نے اُسے بالآخر اپنی طرف آتے دیکھا، وہ دور سے مسکرائی۔ہشام نے بھی اُس کی مسکراہٹ کا جواب مسکراہٹ سے دیا۔

"تم ہر کام بہت جلدی کر لیتے ہو۔"اُس کے قریب آ کر لکڑی کے ایک اُلٹائے ہوئے کریٹ پر بیٹھتے ہوئے اُس نے جیسے ہشام کو سراہا۔وہ واقعی اپنے ذمہ لگائے ہوئے تمام کام بہت تیزی سے کرنے کا عادی تھا۔

"عقل مند ہوں، اس لئے۔"اُس نے جواباً مسکراتے ہوئے چائے کا وہ مگ اس کی طرف بڑھایا جس میں پڑی چائے کے ٹھنڈا ہونے پر اُس نے اسے پھینک کر اُس کے لئے ابھی دوبارہ چائے بنائی تھی۔

"مجھ سے بھی زیادہ"اُس کی ساتھی نے چائے کا مگ ہشام سے لیتے ہوئے بے حد جتانے والے انداز میں کہا۔

"تم سے تو واقعی زیادہ!"اُس نے مصنوعی سنجیدگی سے کہا۔شام اب آہستہ آہستہ گہری ہو رہی تھی، پناہ گزینوں کا وہ ہجوم اب آہستہ آہستہ وہاں سے دور اپنے خیموں کی طرف جا رہا تھا۔وہ جانتے تھے آج انہیں جو کچھ ملنا تھا، مل چکا تھا۔

http://Paksociety.com

ایک کچّی پگڈنڈی نما سڑک کے کنارے سبزے میں لکڑی کے کریٹ اُلٹائے چائے کے سپ لیتے ہوئے وہ دونوں اپنی ٹانگیں سیدھی کیے جیسے اپنی تھکن اُتار رہے تھے۔"تمہارے لئے کچھ ہے"ہشام نے چائے کا آخری گھونٹ لے کر مگ رکھتے ہوئے جیب سے کچھ نکال کر اُس کی طرف بڑھایا۔

******

رئیسہ نے اُس انگوٹھی کو بے حد تعجب کے عالم میں دیکھا تھا جو ہشام نے اُس کے سامنے بڑھائی تھی۔ایک بے حد خوب صورت emarald green باکس میں دھری آنکھوں کو خیرہ کر دینے والی ایک ڈائمنڈ رنگ۔

اُس نے سر اُٹھا کر ہشام کو دیکھا،وہ کچھ دیر کے لئے جیسے چائے پینا بھول گئی جو وہ مگ میں ہاتھوں میں لئے بیٹھی تھی۔

"یہ کہاں سے ملی؟"داداب کے اس ویرانے میں اُس انگوٹھی کو دیکھ کر جو خیال کسی کو آنا چاہیے تھا،وہی رئیسہ کو بھی آیا تھا۔

"کیا مطلب کہاں سے ملی؟"ہشام بُری طرح بدکا تھا۔"میں نے خریدی ہے۔"اُس نے اپنے لفظوں پر زور دیتے ہوئے کہا۔

"کہاں سے؟"وہ پوچھے بغیر نہیں رہ سکی"نیروبی سے"ہشام نے جواباً کہا"پھر مجھے کیوں دے رہے ہو؟"

اُس نے چائے پینا دوبارہ شروع کرتے ہوئے کہا۔سوال کرنے کے باوجود وہ نروس ہوئی تھی،اُسے یک دم اندازہ ہوا تھا کہ یہ کیا ہو رہا تھا۔

"تمہیں پروپوز کر رہا ہوں۔"ہشام نے ایک بار پھر اُس انگوٹھی کو اُس کے سامنے کرتے ہوئے کہا۔رئیسہ نے ایک نظر اُسے دیکھا،ایک نظر اُس انگوٹھی کو اور پھر گردن گھما کر اُس پورے علاقے کو۔۔۔وہ خاردار جھاڑیوں اور پناہ گزینوں کے بیچوں بیچ اسے ایک ڈائمنڈ رنگ پیش کرتے ہوئے پروپوز کر رہا تھا۔۔۔وہ کسی بھی لڑکی کے لئے ایک رومانٹک لمحہ

http://Paksociety.com

تھا، اور اُس کے لئے بھی ہوتا اگر اُسے یک دم ہنسی آنا شروع نہ ہو گئی ہوتی۔۔۔ چائے کا مگ لکڑی کے ایک کریٹ پر رکھتے ہوئے وہ بے اختیار قہقہہ لگاتے ہوئے ہنسی سے بے حال ہونے لگی تھی۔

ہشام بُری طرح نادم ہوا اور اُس نے ڈبیہ بند کر دی۔

"یہ اس طرح ہنسنے کا کیا مطلب ہوا؟" اُس نے رئیسہ سے پوچھا، وہ اب اپنی ہنسی پر قابو پا چکی تھی۔

"ہم یہاں ریلیف کے کام کے لئے آئے ہیں۔" اُس نے ہشام کو یاد دہانی کرانے والے انداز میں کہا "تم کچھ اور سوچ بھی کیسے سکتے ہو؟"

"کیوں نہیں سوچ سکتا؟" ہشام نے بحث کرنے والے انداز میں کہا "ہمیشہ سوچتا رہا ہوں اور بس میرا دل چاہا میں تمہیں پروپوز کر دوں تو کر دیا۔"

رئیسہ نے چائے کا مگ دوبارہ منہ سے لگا لیا، وہ اب سنجیدہ تھی۔ ہشام ڈبیہ ہاتھ میں پکڑے چُپ چاپ اُسے چائے پیتے دیکھتا رہا پھر اُس نے کہا۔

"تم کچھ نہیں کہو گی؟" "میں اس بارے میں کچھ بھی نہیں کہہ سکتی to bevery honest ۔۔" اُس نے بالآخر چائے کا مگ رکھ دیا۔ وہ اب اپنے بیگ پیک کو کھول کر ایک ریڈیو نکال رہی تھی، وہ جیسے گفتگو کا موضوع بدلنے کی کوشش تھی۔

"کیوں۔۔۔؟؟ تم پسند نہیں کرتی مجھے؟" ہشام بھی یک دم سنجیدہ ہو گیا۔

"کرتی ہوں۔۔۔ تمہیں کوئی بھی ناپسند نہیں کر سکتا، لیکن شادی کا فیصلہ بہت بڑا فیصلہ ہوتا ہے۔۔۔ میں خود نہیں لے سکتی۔۔۔ تمہیں میری فیملی کی رضامندی مجھے پروپوز کرنے سے پہلے لینی ہو گی۔" ریڈیو فریکوئینسی سیٹ کرنے کی کوشش کرتے ہوئے اُس نے ہشام کی طرف دیکھے بغیر اُس سے بے حد سنجیدگی سے کہا تھا۔

http://paksociety.com

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-

"Fair enough۔۔۔"ہشام نے بے اختیار اطمینان کا سانس لیا"میں اُن سے بات کرلوں گا، یہ تو بڑی بات نہیں۔"

رئیسہ اُسے کہہ نہیں سکی کہ اُس کی قومیت اُس کی فیملی کے لئے قابلِ اعتراض ہو سکتی تھی، وہ ایرک اور عنایہ کے معاملے پر امامہ کی رائے سے بہت اچھی طرح واقف تھی۔۔۔وہ اپنے تمام بچوں کی شادیاں پاکستانیوں سے کرنا چاہتی تھی۔

"تم یہ رنگ اپنے پاس رکھ لو، میں تمہاری فیملی سے بات کرلوں تب تم پہن سکتی ہو۔"ہشام نے وہ ڈبیہ ایک بار پھر اُس کی طرف بڑھایا۔رئیسہ نے اپنا ہاتھ اُس کی طرف نہیں بڑھایا تھا، وہ اپنے گھٹنے پر رکھے ریڈیو کے ساتھ مصروف تھی یا کم از کم یہی ظاہر کر رہی تھی۔

"اس کا فائدہ نہیں۔۔۔اگر میں نے رنگ لے لی اور میری فیملی نے انکار کر دیا تو؟"اُس نے ہلکی آواز میں خبریں سُنتے ہوئے کہا۔ہشام نے بے یقینی سے اسے دیکھا۔

"تمہاری فیملی انکار کیسے کر سکتی ہے؟"وہ پہلی بار کچھ بے چین ہوا تھا"ہمیں ہر possibility سامنے رکھنی چاہیے۔"

رئیسہ نے مدہم آواز میں جیسے اُسے سمجھایا۔

"وہ انکار کر دیں گے تو؟"ہشام نے پوچھا"تو بس"رئیسہ نے کہا"یعنی بس ختم؟"ہشام کو جیسے یقین نہیں آیا۔

"تم یہ کیسے ہونے دو گی۔۔۔میرے لئے تمہاری کوئی فیلنگز نہیں ہیں؟"ہشام کو جیسے یہ بات ہضم نہیں ہو پا رہی تھی۔

"فیلنگز ہیں تمہارے لئے لیکن وہ میری اپنی فیملی کے لئے فیلنگز سے بہت کم ہیں۔۔۔کم از کم ابھی تم اپنی فیملی کی مرضی کے خلاف کچھ کر سکتے ہو؟"رئیسہ نے بے حد سنجیدگی سے کہا۔

"ہاں میں کر سکتا ہوں کم از کم تم سے شادی تو"اُس نے جواباً کہا تھا۔رئیسہ کو جیسے اس جواب کی توقع نہیں تھی۔ریڈیو کو چھیڑتے ہوئے اُس نے مدہم آواز میں کہا۔

http://Paksociety.com

"ویسے یہ جو رنگ میں ڈائمنڈ ہے، یہ نقلی ہے۔" ہشام بُری طرح چونکا، وہ بات کو کہاں سے کہاں لے گئی تھی۔ اُس نے بے اختیار ہاتھ میں پکڑی ڈبیہ کھولی اور اُس میں سے انگوٹھی نکال کر اُسے آنکھوں کے پاس لے جاتے ہوئے بولا "تمہیں کیسے پتہ؟"

"کیوں کہ میں نے اسے اچھی طرح دیکھا تھا۔ ممیری ممّی کے پاس بہت سارے ڈائمنڈز ہیں، میں ڈائمنڈ پہچان سکتی ہوں۔" رئیسہ نے اُسی انداز میں کہا۔

وہ ویک اینڈ پر نیروبی گئے تھے اور جیولری کی shops میں پھرتے ہوئے ایک شاپ پر رئیسہ کو یہ انگوٹھی اچھی لگی تھی۔۔۔ جو ہشام نے اُسے بتائے بغیر خرید لی تھی، وہ اُسے اسی انگوٹھی کے ساتھ پروپوز کرنا چاہتا تھا۔

"مجھے یقین نہیں آرہا۔۔۔ تم نے مجھے تب کیوں نہیں بتایا؟ میں نے تو ڈائمنڈ کی رنگ کے طور پر بہت مہنگا خریدا ہے اُسے۔" ہشام حیران سے زیادہ کچھ شرمندہ ہوا۔

"مجھے یہ تھوڑی پتہ تھا کہ تم اسے خریدنا چاہتے ہو۔۔۔ مجھے تو بس اچھی لگی تھی اور جیولر کہہ رہا تھا ڈائمنڈ ہے تو میں اُسے شرمندہ نہیں کرنا چاہتی تھی یہ بتا کر کہ یہ ڈائمنڈ نہیں ہے۔" رئیسہ نے اُس سے کہا۔

ہشام نے کچھ مایوسی کے عالم میں اُس رنگ کو ڈبیہ میں رکھ کر ڈبیہ بند کر دی۔ رئیسہ نے اُس کے تاثرات دیکھے اور ہاتھ بڑھا کر تسلّی دینے والے انداز میں اُس ڈبیہ کو پکڑ لیا۔

"تمہارا بڑا نقصان ہو گیا۔" اُس نے جیسے ہشام کو تسلّی دی "نہیں اتنا نقصان نہیں ہوا، جتنی شرمندگی ہوئی ہے کہ میں ایک نقلی ڈائمنڈ کے ساتھ تمہیں پروپوز کر رہا تھا۔"

رئیسہ نے اُسے تسلّی دینے والے انداز میں کہا۔ "پریشان مت ہو، میں اسے رکھ لیتی ہوں۔۔۔ اگر میری فیملی مان گئی تو میں یہی رنگ پہن لوں گی۔" وہ بے اختیار ہنس پڑا۔۔۔ وہ رنگ جو وہ محبت میں لینے پر تیّار نہیں تھی، ہمدردی میں لے رہی تھی۔۔۔ وہ واقعی ریلیف ور کر تھی۔

http://Paksociety.com

"ہنس کیوں رہے ہو؟" وہ حیران ہوئی "خوش ہوں اس لئے" ہشام نے جواباً کہا۔

"مجھے سٹونز میں ڈائمنڈ کی پہچان ہو نہ ہو، انسانوں میں ہے۔۔۔ اور میں نے ایک نقلی ڈائمنڈ ایک اصلی ڈائمنڈ کو دیا تھا، کم از کم مجھے اس بارے میں کوئی شبہ نہیں۔" ہشام نے اتنے سال کے ساتھ میں اُسے پہلی بار بلش کرتے دیکھا۔

وہاں اب خاموشی تھی۔۔۔ ہوا کی سرسراہٹ۔۔۔ اُترتی شام اور اُس میں ریڈیو پر چلنے والا نیوز بلیٹن جس میں بحرین میں ایک طیّارے کے کریش ہونے کی خبر دی جا رہی تھی، جس پر وہ دونوں اکٹھے متوجہ ہوئے تھے۔

******

آج بہت لمبے عرصے کے بعد امامہ اُس کمرے میں اُس باکس کو کھولے بیٹھی تھی۔ ایک ایک کر کے وہ سارے سکیچ بکس اور سکریپ بکس نکالے جس پر کئی دہائیوں پہلے اُس نے اپنے گھر کی بنیادیں پنسل اور رنگوں سے رکھنی شروع کی تھیں۔

وہ اس کمرے کی صفائی کروانے کے لئے ملازم کے ساتھ وہاں آئی تھی اور صفائی کرواتے ہوئے اس باکس کو دیکھتے ہی اُسے بہت کچھ یاد آ گیا تھا، اور اب صفائی مکمل کروانے کے بعد وہ اس باکس کو اپنے کمرے میں لے آئی تھی۔۔۔ بڑی فرصت سے پرانی یادوں کو کھنگالنے اور جینے کے لئے۔

وہ ایلس اِن ونڈر لینڈ کی طرح انہیں کھولے کہیں سے کہیں پہنچ گئی تھی۔ اتنی دہائیاں گزرنے کے بعد وہ سکریپ بکس خستہ حال ہو رہی تھیں، سکیچز میں بھرے ہوئے رنگ اُڑنے لگے تھے، لکھے ہوئے لفظ مٹنے لگے تھے، کھینچی ہوئی لکیریں دُھندلانے لگی تھیں۔۔۔ لیکن ان دُھندلاتی لکیروں، مٹتے لفظوں، پھیکے پڑتے رنگوں اور بُھربُھراتے کاغذوں میں بھی اُسے ہر یاد ویسی ہی رنگین، تازہ، خوشگوار، زندہ محسوس ہو رہی تھی جیسے وہ سب آج ہی کا قصّہ تھا۔۔۔ کل ہی کی بات تھی، پرسوں ہونے والا واقعہ تھا۔۔۔

http://Paksociety.com

وہ مدہم مسکراہٹ کے ساتھ ہر صفحہ بڑی احتیاط سے پلٹ رہی تھی یوں جیسے ذرا بے احتیاطی ہوئی تو رنگ جھڑ جائیں گے، لکیریں رگڑ کھا کر چُھو منتر کی طرح غائب ہو جائیں گی، سب کچھ غائب ہو جائے گا، اپنے ساتھ اُس کی زندگی کے بہترین دنوں کو لے کر بھی۔

ہر صفحے پر اُس کے ہاتھ کے بنے سکیچز تھے۔۔۔ کون سا کمرہ کیسے بننا تھا۔۔۔ کس دیوار پر کیا لگنا تھا۔۔۔ کہاں کیسا رنگ ہونا تھا۔۔۔ اُس کے ہاتھ کی تحریر میں وہ چیزیں لکھی ہوئی تھیں۔۔۔ ہر صفحہ، ہر لکیر، ہر تصویر یک دم جیسے بولنے لگی تھی۔ اُس کے اور سالار کے درمیان ہونے والی باتیں۔۔۔ وہ ہر چیز بنا کر سالار کو دکھاتی تھی، اُس سے رائے لیتی تھی، جب بھی جہاں بھی کسی کے گھر اُسے کوئی چیز پسند آجاتی وہ چیز اُس کی سکریپ بُک میں موجود اُس کے گھر کے کسی کمرے کا حصّہ بن جاتی تھی۔ اُن صفحات پر بنی تصویروں کو دیکھتے ہوئے اُس کے کانوں میں اپنی اور سالار کی آوازیں گونجنے لگی تھیں۔۔۔

پتہ نہیں زندگی اتنی تیزی سے کیوں گزرتی ہے یا پھر بالکل رُک کیوں جاتی ہے۔ جب وہ سالار کے ساتھ تھی تو سب کچھ ہوا کی رفتار سے گزر جاتا تھا۔۔۔ اب وہ اُس کے ساتھ نہیں تھی تو سب کچھ ایسے رُک گیا تھا جیسے زندگی کو زنگ ہی لگ گیا ہو۔

اُس نے ایک صفحہ اور پلٹا۔۔۔ پھر ایک اور۔۔۔ پھر اور۔۔۔ اس سکیچ بُک میں موجود گھر بناتے ہوئے اُسے کبھی اندازہ نہیں تھا کہ وہ زندگی میں صرف یہی ایک گھر بنا سکتی تھی وہ بھی کاغذوں پر۔۔۔ حقیقت میں نہیں، وہ محنت اور وقت جو اُس نے اُس گھر پر لگایا تھا شاید اُتنی ہی مدّت تھی جتنی کوئی اپنے گھر پر لگاتا تھا لیکن اُس کا گھر اس مدّت کے بعد بھی کاغذوں پر ہی رہا تھا، کبھی زمین پر حقیقت بن کر کھڑا نہیں ہو سکا تھا۔

اُس کی زندگی کی بہت ساری خواہشات میں صرف وہ ایک ایسی تھی جو حسرت بنی تھی، اور اب تو ایک مدّت ہو گئی تھی اُس نے "گھر" کے بارے میں سوچنا ہی چھوڑ دیا تھا۔۔۔ آج بس اُس باکس کو دیکھنے پر اُسے یاد آیا تھا اُس نے کبھی ایک گھر بنانے کی کتنی خواہش کی تھی۔۔۔ بچت بھی کی تھی۔۔۔ کوشش بھی۔۔۔ لیکن بعض چیزیں مقدر میں نہیں ہوتیں۔

http://Paksociety.com

اُن صفحوں پر پھیلی خوابوں کے گھر کی وہ تصویریں اُس کی زندگی کے سب سے اچھے دنوں کی تصویریں تھیں۔اُن کے درودیوار سے اُس کی خوشیاں اب بھی چھلکتی تھیں۔۔۔اتنے سالوں کے بعد بھی۔۔۔

وہ گھر حقیقت میں نہ ڈھلنے کے باوجود اُسے عجیب خوشی دے رہا تھا۔۔۔عجیب طرح سے گدگدا رہا تھا۔۔۔جیسے کوئی ننھا بچّہ اپنا دل پسند کھلونا پا لینے پر کھکھلاتا ہو۔

ایک گہرا سانس لے کر اُس نے اُن سکیچ بکس کو بند کیا لیکن پھر باکس میں رکھنے کے بجائے وہیں سامنے پڑی میز پر رکھ دیا۔

اُسے امریکہ سے آنے والے اُس مہمان کے استقبال کی تیّاری کرنی تھی جو تھوڑی دیر میں وہاں پہنچ رہا تھا۔

******

وہ جبریل سکندر کی ڈاکٹر ویزل برنارڈ کے ساتھ آخری سرجری تھی۔۔۔وہ اُس کے بعد ریٹائر ہو رہے تھے اور اُن کے اسسٹنٹ کے طور پر وہ آخری سرجری اُس کی زندگی کی سب سے اہم سرجری تھی۔

وہ پانچ سالہ ایک بچّہ تھا جو سیڑھیوں سے گر کر سر پر لگنے والی ایک چوٹ کے بعد کوما میں گیا تھا اور اب اُسے سرجری کی ایمرجنسی میں ضرورت پڑی تھی۔اُس کے برین میں انٹرنل بلیڈنگ ہو رہی تھی۔

جبریل ڈاکٹر ویزل کے ساتھ پچھلے دو سالوں سے کام کر رہا تھا۔وہ امریکہ کی تاریخ کے کامیاب ترین سرجنز میں سے ایک تھے اور جبریل اُن کا پسندیدہ ترین اسسٹنٹ تھا۔

ڈاکٹرز کے سرکل میں ڈاکٹر ویزل برنارڈ کو دیوتا کی حیثیت حاصل تھی،وہ یہودی النسل تھے اور اُن کے ساتھ کام کرنا خود ایک اعزاز سمجھا جاتا تھا۔وہ مزاجاً بے حد اکھڑ اور تیکھے مزاج کے تھے اور بے حد کم کسی کے کام سے خوش ہونے والوں میں سے تھے،خاص طور پر کسی مسلمان کے اور وہ بھی ایشیائی نسل کے۔

اس کے باوجود جبریل سکندر اُن کا چہیتا تھا۔۔۔ کہیں نہ کہیں وہ اُس میں اپنا آپ دیکھتے تھے، اُس کے composure اُس کی skill کو۔۔۔ اور یہ بات اُس ہاسپٹل میں سب کو پتہ تھی کہ ڈاکٹر ویزل کو ٹھنڈا رکھنے کا کام جبریل سکندر سے بہتر کوئی نہیں کر سکتا۔

اور جتنے مہربان وہ جبریل کے ساتھ تھے، اتنا ہی متاثر وہ ڈاکٹر ویزل سے تھا۔ نیورو سرجن کے طور پر اُن کا ڈنکا اگر دُنیا میں بجتا تھا تو وہ اس قابل تھے۔۔۔ اپنی بدمزاجی کے باوجود۔

انہوں نے ساری عمر شادی نہیں کی تھی۔۔۔ دو کتّے اور دو بلیلاں پالی تھیں اور ساری زندگی ان ہی کے ساتھ گزاری تھی اور انہوں نے جبریل کو بھی اپنے ساتھ پہلی ملاقات میں پہلا مشورہ یہی دیا تھا۔

"تم اس فیلڈ میں بہت آگے جاسکتے ہو، اس لئے شادی مت کرنا۔۔۔ اپنے پروفیشن اور کیریئر کو فوکس کرنا۔۔۔ دُنیا کا ہر شخص اپنی زندگی اچھی کرنے کے لئے شادی کر سکتا ہے، لیکن دُنیا کا ہر شخص دوسروں کی زندگی بچانے کے لئے اپنی زندگی قربان نہیں کر سکتا۔" انہوں نے جبریل کو نصیحت کی تھی جو اُس نے مسکرا کر سُنی تھی۔

اور اب اتنا عرصہ اُن کے ساتھ گزارنے کے بعد وہ ڈاکٹر ویزل کے مزاج کو بخوبی سمجھ اور پڑھ سکتا تھا۔

"تمہارا ہاتھ مسیحا کا ہاتھ ہے، کیوں کہ تم اچھے ماں باپ کا خون رگوں میں لیے ہوئے ہو اور قرآن کے حافظ ہو۔۔۔ اپنی اس مسیحائی کی حفاظت کرنا۔" انہوں نے چند دن پہلے اُس کے اپارٹمنٹ پر اُس کے ساتھ کھانا کھاتے ہوئے کہا تھا جو اُس کی طرف سے اُن کے لئے ایک الوداعی ڈنر تھا۔ وہ اُن کی بات پر حیران رہ گیا تھا۔ وہ ایک بے حد متعصب اور کٹر قسم کے یہودی تھے، اُن کی زبان سے قرآن حفظ کرنے کو مسیحائی سے جوڑنا جبریل کے لئے ناقابلِ یقین تھا اور اُس کے چہرے اور آنکھوں کی حیرانی نے جیسے اُس کے تعجب کو اُن تک بھی پہنچایا تھا۔

"بُرے مسلمان بُرے لگتے ہیں، اچھے نہیں۔" وہ کہہ کر اپنی ہی بات پر خود ہنسے تھے۔

"آپ سے بہت کچھ سیکھا ہے میں نے۔" جبریل بے بھی اُنہیں خراجِ تحسین پیش کرنا چاہا تھا۔ انہوں نے ٹوکتے ہوئے کہا۔

http://Paksociety.com

"میں نہ بھی ہوتا تو بھی تم سیکھتے۔۔۔مجھے خوشی ہے کہ مجھے بھی اپنی زندگی کے آخری سالوں میں تمہارے ساتھ کام کرنے کا موقع ملا۔" انہوں نے جواباً اُس سے کہا۔

ڈاکٹر ویزل کی شخصیت کے اس پہلو کی جھلک صرف جبریل نے دیکھی تھی اور کوئی کبھی مر کر بھی یقین نہیں کر سکتا تھا کہ وہ کسی کے لئے اتنے مہربان ہو سکتے تھے۔جبریل کو اُن کے ساتھ کام کرنا کبھی مشکل نہیں لگا تھا لیکن اب اُن کے جانے کے بعد وہ خود ایک سرجن کے طور پر اپنے کیریئر کا آغاز کرنے جا رہا تھا۔

آپریشن ٹیبل پر لیٹے ہوئے اُس بچے کے دماغ کا آپریشن کرتے ہوئے وہ ڈاکٹر ویزل کے بالکل برابر میں کھڑا تھا،وہ ہمیشہ کی طرح گپ شپ کر رہے تھے،اپنے طویل میڈیکل کیریئر کے حوالے سے جب اُن کی گفتگو میں پہلی بار جبریل نے کچھ اُداسی محسوس کی تھی۔پھر اُس نے ڈاکٹر ویزل کو اوزار سے اُس بچے کے دماغ میں بلیڈنگ روکنے کے لئے ایک اور جگہ پر کٹ لگاتے دیکھا۔سیکنڈ کے ہزارویں حصّے میں جبریل کو کچھ کھٹکا تھا،وہ اُن کا ہاتھ چلتے دیکھ رہا تھا لیکن اُسے لگا تھا کچھ غلطی ہوئی تھی۔۔۔اُس کا احساس ٹھیک تھا،وہ بچہ ہوش میں نہیں آ سکا تھا۔ڈاکٹر ویزل کے پروفیشنل کیریئر کی آخری سرجری ناکام رہی تھی۔۔۔عائشہ عابدین نے اپنی اکلوتی اولاد کھو دی تھی۔

(باقی آئندہ ماہ انشااللہ)

http://Paksociety.com